مدیر مسئول
محمد عطاء اللہ حنیف

جماعت اہلحدیث کا ترجمان اور مسلک اہلحدیث کا داعی

جلد ۳۶ شمارہ ۴۹ جمعۃ المبارک ۱۶- شوال ۱۴۰۵ھ ۵- جولائی ۱۹۸۵ء

مندرجات

مجلس ادارت
حافظ صلاح الدین یوسف
علیم ناصری
ایم اے

معاون
محمد سلیم انصاری

بدلِ اشتراک: سالانہ ۵۰ روپے
فی پرچہ ڈیڑھ روپیہ
ممالک غیر سے
۲۰ پونڈ

تبصرہ کتب

علیم ناصری

خلافت و جمہوریت

مصنف: مولانا عبدالرحمن کیلانی
ضخامت: درمیانہ سائز ۲۸۸ صفحات - مجلد رنگین ٹائٹل
قیمت ۳۶ روپے - طبع دوم
ناشر: مجلس التحقیق الاسلامی - ۹۹ - جے ماڈل ٹاؤن - لاہور

پاکستان میں طرزِ حکومت پر ایک عرصے سے قال و قیل چل رہی ہے۔ مگر اب تک یہ واضح نہیں ہو سکا کہ یہاں کیسی حکومت رائج ہونی چاہیئے۔ پاکستان فقط اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اور یہاں حکومت، معاشرت، معیشت، ثقافت، تعلیم، تمدن وغیرہ کو اسلام ہی کے تابع رکھنے کے وعدے اور دعوے کئے گئے تھے۔ مگر افسوس کہ ان میں سے نہ کوئی وعدہ وفا ہو سکا۔ اور نہ کوئی دعویٰ پروان چڑھ سکا۔ اگرچہ آغاز ہی سے یہاں حکومت تو "پارلیمانی جمہوریت" رہی ہے۔ مگر عملی طور پر اس کا انداز کار سیکولر طرزِ حکومت کا رہا ہے۔ برطانیہ کی سو سالہ غلامی نے خاص طور پر مسلمانانِ ہند کی ذہنی شست و شو (BRAIN WASHING) اس طرح کر رکھی تھی کہ وہ کوئی نیا انداز اپنانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ نہ قوانین میں کوئی تبدیلی کی گئی اور نہ حکومت کو اسلام کے قریب لانے کی کوشش کی گئی ـــ بس ـ ع

از طاق بادہ گیرم و در ساغر افگنم ـــ پر ہی عمل کیا گیا اور انگریز کے پس خوردہ پر ہی گزارہ چلتا رہا۔ پاکستان کا تصور دینے والے علامہ اقبالؒ نے اگرچہ مغربی جمہوریت کے ایوان کو "کفن دزدوں" سے تشبیہ دی تھی اور انہیں محض بندوں کو گننے والا گروہ قرار دیا۔ مگر علامہ مرحوم کی یاد میں "یوم" مناتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے اور ان سے عقیدت و محبت کا دم بھرنے والے ان کی اس تنبیہہ سے کوئی سبق حاصل نہ کر سکے

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

اسلام نے ہمیں خلافت کا طرزِ حکومت دیا ہے۔ جس کی بنیاد تقوے اور پرسشِ آخرت کے تصور پر استوار کی گئی ہے جب کہ جمہوریت کا مزاج محض حکومت کرنا اور اقتدار میں شریک ہونا ہے جس سے دنیاوی شرکت و عظمت اور مال و دولت کا حصول ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ دعوئے "خدمتِ ملت" ہی کا کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں مولانا عبدالرحمن کیلانی نے جمہوریت اور خلافت کا موازنہ نہایت دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ تاریخ و سیرت کی کتب سے مستند حوالہ جات کے ذریعے مولانا نے اپنا موقف واضح کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اسلامی طرزِ حکومت مغربی جمہوریت نہیں بلکہ خلافت ہے ـــ مولانا کے یہ مضامین پہلے ماہنامہ "محدث" لاہور میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کو یکجا کر کے مجلس التحقیق الاسلامی، ماڈل ٹاؤن لاہور نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے زیرِ نظر ہے۔ مولانا کا اندازِ بیان نہایت سلجھا ہوا، سادہ اور رواں دواں ہے۔ جس سے قاری کو کسی صورت اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کتاب نہ صرف عوام و خواص بلکہ حکومت کے دفاتر اور اسمبلیوں کے ایوانوں تک پہنچنی چاہیئے۔ اور عوامی نمائندوں کے مطالعے میں آنی چاہئے تاکہ وہ اسلامی نظامِ حکومت کے اصل خد و خال سے آگاہ ہو سکیں ـــ مولانا کیلانی نے اپنا فریضہ ادا کر دیا ہے۔ اور مجلس التحقیق الاسلامی نے اسے شائع کر کے اپنا دینی اور صحافتی فریضہ پورا کر کے سرخروئی حاصل کر لی ہے۔ اس پر عمل کرنا یا کروانا حکومت کی ذمہ داری ہے یا منتخب نمائندگان کی ـــ ہمیں اُمید ہے کہ اس کتاب کے مندرجات پر تمام تر نہ سہی کچھ حصے پر تو فوری عمل کروایا جا سکتا ہے اور یہاں خالص اسلامی نہ سہی اسلام کے قریب تر حکومت کی تشکیل تو کی جا سکتی ہے ـــ !!

تبصرہ کے لیے کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیے

فون مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (رہائش)
۶۲۴۷۶
۱۶۔ شوال ۱۴۰۵ھ
۵۔ جولائی ۱۹۸۵ء

فون دفتر الاعتصام
۵۴۴۰۶
جلد ـــ ۳۶
شمارہ ـــ ۴۹

عید یومِ تشکّر ہے یومِ تعیّش نہیں

ماہِ رمضان تمام ہوا۔ ہلالِ عید نے یومِ تشکّر کا اعلان کیا۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں پر جو روزے فرض ٹھہرائے تھے الحمد للہ ان کی تکمیل ہوئی۔ جن حق شعاروں نے اس تپش اندوز موسم میں روزے رکھے ان کا اجر اللہ تعالےٰ کے ہاں ثابت ہوا۔ ان کے دنوں کی تشنہ لبی اور راتوں کا قیام ملائکہ کی سفارشات کا مورد ٹھہرا۔ اور احکم الحاکمین کی رحمتوں اور بخششوں کے باب کھلے۔ جنّت کی ابدی نعمتوں اور کامرانیوں کی نویدیں ملیں۔ اور مؤمنین کے سر سجدۂ شکرانہ کے لئے دربارِ خداوندی میں جھک گئے ـــ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

ملک بھر میں عید کا تہوار نہایت شان و شوکت سے منایا گیا۔ ہر خورد و کلاں شاداں و فرحاں عید کی خوشیوں میں شامل ہوا۔ مبارک سلامت کی دعائیں گونجیں اور روزہ داروں اور روزہ خوروں کی تمیز کا احساس ختم ہو گیا۔ عید کے جشن میں محمود و ایاز اور نیک و بد میں کوئی فرق نہ رہا۔ بلکہ جن کو روزہ رکھنے کی توفیق نہیں ہوئی انہوں نے عید کی خوشی دوسروں سے بڑھ چڑھ کر منائی۔ عید کے بعد شائع ہونے والے اخبارات نے جشنِ عید اور جشنِ ٹرد کی جو خبریں اور تصویریں شائع کیں ان سے تو ہم یہی سمجھے کہ عید منانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جن کے پیغام شائع ہوئے۔ اور جن کی تصویریں مع ان کے تأثرات کے اخبارات کی زینت بنے۔ عوامی نمائندگی کے دعویدار اخبارات نے اپنے سرورق کی رنگینی میں قوسِ قزح کی ہفت رنگی کا سماں پیدا کر دیا۔ فلم ایکٹریسوں کی تصویروں نے تو "اِندر سبھا" کو شہ مات دے دی۔ رنگا رنگ پکوانوں کے ساتھ ایک محترمہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ دوسری محترمہ اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے شیر خرما کا لقمہ ایک قیامت خیز ادا کے ساتھ اپنے منہ میں ڈالتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ دو "میڈمیں" ایک دوسرے سے گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں جن کے چہروں پر ہنسی کے فوارے پھوٹ رہے ہیں۔ کہیں آسمانِ فلم کے ان چاند ستاروں کا جھرمٹ ہے جو آپس میں چہلیں کر رہی ہیں۔ اس پہ طرّہ یہ کہ تمام تصویریں قدِ آدم ہیں جو سر سے پاؤں تک زیب و زینت کا شاہکار بنی ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا کے کارپردازوں اور فلم ایکٹروں کی تصویریں الگ بہار دکھا رہی ہیں اور یہ تمام اہتمام اخباروں نے اس لیے کیا ہے تاکہ قوم کو پتہ چلے کہ ان کے ہیروؤں اور ہیروئنوں نے کس طرح عید منائی ـــ قوم کے دوسرے لوگوں نے کس طرح عید منائی۔ یہ کسی کو خبر نہیں ـــ

البتہ صدر مملکت ، وزیر اعظم اور صوبائی وزراء کو ضرور عید کی نماز پڑھتے ہوئے دکھایا گیا ہے ۔ ان کے علاوہ ملک بھر کے ناداروں ، مفلسوں ، کم درجے کے شہریوں اور درمیانے درجے کے لوگوں کا کیا حال رہا ۔ اس کی خبر ۔۔۔ ؟ خدا جانے ۔۔۔ !! یہ اخباروں کا نہیں حکومت اور قوم کا سر درد ہے ۔۔۔ اور ہمارے یہ وہ اخبار ہیں جن کو حکومت کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کا گلہ ہے ۔ اور وہ حکومت کے خلاف تو نہیں لکھ سکتے تو اس کے عوض پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور ان کی تعلیمات کا حلیہ تو بگاڑ سکتے ہیں ۔۔۔ اعاذنا اللہ منہ ۔

یار لوگوں نے عید کو کھانے پینے اور لباس فاخرہ پہننے کا تہوار بنا لیا ہے ۔ رمضان کے آغاز ہی سے درزیوں ، اور جفت سازوں کی دکانیں رات دن چوبیس گھنٹے کھلی رہیں اور لوگوں کے لیے عید کا لباس اور جوتے تیار ہوتے رہے جو عید کے دن پہنے گئے اور بازاروں میں ہڑبونگ مچتا رہا ۔ دکانداروں نے جی بھر کر لوگوں کو لوٹا ۔۔۔ ہر چیز کے دام ڈیوڑھے اور دگنے وصول کئے گئے ۔۔۔ گوشت کی قیمت بتیس ۔ چونتیس روپے کلو ہو گئی ۔ پھل فروٹ صرف امراء کی دسترس میں رہا ۔ برف والوں کی چاندی ہو گئی اور مٹھائی والوں کا سونا ہو گیا ۔

اور عید الفطر جسے ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم تشکر قرار دیا ہے ہم نے اسے یوم تعیش بنا دیا ۔۔۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۔۔۔ !!

معاشرے کے اس رنگ اور ڈھنگ کی ذمہ داری کس پر ہے ؟ اسلامی نظام کی دعویدار حکومت پر یا عشق رسول ؐ کے دعویدار معاشرے پر ۔ ؟

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ۔۔۔ !!

مولانا قاضی شمس الدین صاحب کا سانحۂ ارتحال

گوجرانوالہ کے دیوبندی عالم مولانا قاضی شمس الدین صاحب بھی حضرت حافظ محمد گوندلوی علیہ الرحمۃ کے انتقال سے کوئی ہفتہ بھر پہلے انتقال فرما گئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ محترم قاضی صاحب مرحوم ایک بلند پایہ حنفی عالم تھے ۔ مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک اور صلح کل مشرب کے حامل تھے ۔ حنفیت پر تقلید کے قائل ہونے کے باوجود حدیث سے گہرا شغف رکھتے تھے ۔ اور بعض مسائل میں مسلک سلف کے بہت قریب تھے ان کے جنازے میں گوجرانوالہ کے اہلحدیث حضرات بھی شریک تھے اور انہی میں سے ایک دوست کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کے جنازے پر مولانا عنایت اللہ گجراتی مدظلہ نے بلند آہنگی سے فرمایا کہ قاضی صاحب مرحوم نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اس لیے ان کے جنازے میں سورہ فاتحہ بھی پڑھی جائے ۔ لہٰذا اس پر عمل کیا گیا اور نماز جنازہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ادا کی گئی ۔ الحمد للہ کہ حدیث مصطفیٰ سے مرحوم کی محبت نے ان کے سفر آخرت میں بھی ان کا ساتھ دیا ۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب فرمائے اور اپنے صالحین میں شامل فرمائے ۔ آمین

خواجہ عبدالقیوم کھلو کا انتقال

کشمیر کارپٹ فیکٹری کے مالک اور لاہور کے معروف تاجر خواجہ عبدالقیوم کھلو ہفتہ ۲۲ جون ۱۹۸۵ء کو انتقال فرما گئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ خواجہ صاحب مرحوم سلفی العقیدہ بزرگ ، نہایت پارسا ، شریف النفس اور نیک نہاد شخصیت کے مالک تھے ۔ ایک عرصے تک مسجد مبارک (اسلامیہ کالج) میں حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف حفظہ اللہ کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھتے رہے ۔ مولانا موصوف سے مرحوم کو بے پناہ عقیدت تھی جس کے باعث دارالدعوۃ کے بھی معاون تھے ۔ خواجہ صاحب کی وفات کی خبر سن کر حضرت مولانا اپنی علالت اور نقاہت کے باوصف تعزیت کے لیے تشریف لے گئے اور ان کے لواحقین سے اظہار ہمدردی فرماتے ہوئے مرحوم کے لئے فوز عاقبت کی دعائیں فرمائیں ۔ ادارہ الاعتصام مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے اور ان کے لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے ۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

مولانا محمد منیر قمر سیالکوٹی ترجمان ام القیوین کورٹ
ناظم اعلیٰ مرکزی جماعت اہلحدیث (متحدہ عرب امارات)

نمازوں کے بعد سلام و مصافحہ کی شرعی حیثیت

۲۷ جنوری ۸۵ء کا روزنامہ نوائے وقت" لاہور" میرے سامنے ہے اس کے مستقل کالم" نور بصیرت" کے کالم نگار جناب میاں عبدالرشید صاحب کے کالم کو پڑھنے سے کچھ یوں لگتا ہے کہ جیسے اہل بدعت سے کچھ رشوت کھائے ہوئے ہوں کہ کئی بدعات کو بلا ہچکچاہٹ بڑی ڈھٹائی اور روانی سے ایک ہی سانس میں سنت و ثواب ثابت کرنے کی سعی فرما رہے ہیں۔

یار لوگ اتباعِ سنت اور حبِّ رسولؐ بلکہ عشقِ رسولؐ میں غلطاں و پیچاں ہونے کے دعوے کرتے تو تھکتے نہیں مگر جب ان کے اقوال و اعمال کا بنظرِ غائر جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شاید شریعت رسول نعوذ باللہ نامکمل اور نعمتِ الٰہی نا تمام ہے اور یہ" عاشقانِ رسولؐ" و "فدائیانِ سنت" اس شریعت کو مکمل کرنے کی سعی نامشکور کرتے رہتے ہیں۔ اس میں ٹانکے لگاتے رہتے ہیں۔ گھر بیٹھے خدائی نام" شریعت سازی" کی مشق فرماتے رہتے ہیں۔ کیا اتباعِ سنت کا یہی مفہوم ہے؟ ہرگز نہیں۔ اتباعِ سنت کا مفہوم تو بڑا سادہ اور آسان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کاموں کو کیا یا کرنے کا حکم دیا۔ یا کرتے دیکھا اور منع نہ کیا۔ ان کاموں کو انہی حدود و قیود کے ساتھ بجالایا جائے۔ اور جن کاموں کو نہ کیا اور روکا ان سے رکا جائے۔ یہی اتباعِ سنت۔ یہی اطاعت رسول اور یہی اطاعتِ الٰہی ہے۔ مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (حدیث) اللہ محفوظ رکھے..... ان شریعت ساز ملاؤں اور جاہل صوفیوں کے بچھائے ہوئے دام ہمرنگ زمیں میں ہمارے ناخواندہ و بے علم بھائی بڑی آسانی سے پھنس جاتے ہیں کیونکہ یہ ٹولہ جو اعمال ایجاد کرتا اور انہیں سنت و ثواب قرار دیتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک پہ" ایک حسین عمل" کا دھوکہ ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت انہیں اسلام اور اعمال صالحہ و مسنونہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صرف بدعت اور نرا دھوکہ ہوتے ہیں، جسے آپ "حسین دھوکہ" کہہ سکتے ہیں۔

بدعت چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو، اس کی شکل و صورت اور ہیئت کذائی خوبصورت اسلامی رنگ میں ہوتی ہے سوائے بعض حدود و قیود کے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان بدعات پر گمراہی اور موجب جہنم جیسے الفاظ کا اطلاق کرتے ہوئے اپنے آپ کو بڑا سنبھال کے قدم رکھنا پڑتا ہے۔

بدعت کی انوکھی و من مانی تعریف ٹھہرا کے تحت متعدد بدعات کی ترویج پر مبنی میاں عبدالرشید صاحب کا پورے کا پورا کالم ہی تیرگی بر دوش اور" تن ہمہ داغ داغ شد" کی صحیح تصویر و قابلِ مواخذہ ہے۔ جس پر قدرے طویل تعاقب لکھ کر رکھا ہوا تھا کہ اتنے میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب الفلاح کا لکھا ہوا تعاقب بعنوان" بدعت کی انوکھی تعریف" "ہفت روزہ الاسلام" شمارہ ۴۳ میں نظر سے گزرا والذی قد اجاد فیہ و افاد فجزاہ اللّٰہ خیراً۔

اسی پر کفایت کرتے ہوئے اپنے اس تعاقب کا بقیہ حصہ حذف کر دیا ہے۔ البتہ مالا یدرک کلہ لا یترک جلہ کے مصداق" نمازوں کے بعد سلام و مصافحہ" کے بارے میں چند کلمات ضرور پیش کروں گا تاکہ سند رہے۔

میاں عبدالرشید صاحب! یہ تو حقیقت ہے کہ سلام و مصافحہ سنت ہیں۔ مگر اس مطلق سنت کو بعد نماز کے بعد

کے ساتھ مقید کرنے کی جو شکل آپ لوگوں نے بنا رکھی اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں وہ "مقید شکل" بدعت ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک ہی مسجد میں ایک ہی امام کے پیچھے پانچ نمازیں ادا کرتے ہیں اور ہر فرض نماز کا سلام پھیرنے کے بعد امام صاحب اور دو تین دائیں اور اسی طرح بائیں والے نمازیوں سے سلام و مصافحہ کرنے کے بعد بقیہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھتے ہیں۔ یہ انداز سلام اور مصافحہ کہاں لکھا ہے حالانکہ ضرورت و داعیہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بھی موجود تھا اور کوئی امر مانع نہ ہونے کے باوجود یہ عمل اس زمانہ المشہود لھا بالخیر میں معمول بہ نہ تھا۔ اور جو "کارِ ثواب" صحابہ کرام کو نہ سوجھا اس کے لیے آپ کیوں پریشان اور دبلے ہوئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سنتِ رسول ﷺ اور تعامل صحابہ پر ہی کفایت کریں۔ اور مسلمانوں کو اس "مقید سلام اور مصافحہ" کی بدعت سے دوچار نہ کریں۔ اسی میں ہماری، آپ کی اور عوام الناس کی بھلائی ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بات کی تائید کے لیے اپنے ارسال کردہ ایسے ہی ایک سوال اور اس پر عالم اسلام کے معروف مفتی، مہبط وحی، بلد امین مکہ مکرمہ کی عالمی اسلامی تنظیم "رابطہ عالم اسلامی" کے ڈائریکٹر جنرل اور اسلامک ریسرچ و فتویٰ اور دعوت و ارشاد کے پورے عالم میں پھیلے ہوئے بے شمار سعودی اداروں کے مرکزی رئیس اعلیٰ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ کا فتویٰ بھی نقل کر دوں تاکہ شیخ موصوف کا یہ فتویٰ میرے علاوہ تمام قارئین اردو کے پاس بھی محفوظ ہو جائے۔

اردو ترجمہ: فتویٰ نمبر ۳۲۵۶، تاریخ ۱۳ شوال ۱۴۰۰ھ

حمد و صلوٰۃ کے بعد۔ اسلامک ریسرچ اور فتویٰ کی مستقل کمیٹی نے محمد منیر قمر سیالکوٹی کے رئیس اعلیٰ کی طرف ارسال کردہ اور ریفرنس نمبر ۲/۱۱۱۲ بتاریخ ۱-۸-۱۴۰۰ھ کے تحت کمیٹی کی طرف تحویل کردہ سوال پر غور کیا۔ سوال کے الفاظ یہ ہیں۔

سوال: پنجگانہ نماز کے بعد امام اور دائیں بائیں کے نمازیوں سے سلام و مصافحہ کا التزام کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ شرعی دلائل کے ساتھ وضاحت کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔

کمیٹی نے یہ جواب دیا:-

جواب: پنجگانہ نماز کے بعد امام اور دائیں بائیں والے نمازیوں سے سلام و مصافحہ کرنے کا التزام کرنا بدعت ہے کیونکہ یہ عمل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی سے بھی ثابت نہیں۔ اگر وہ سلام و مصافحہ کرتے ہوتے تو (دیگر تمام اعمال کی طرح) یہ بھی ہمارے لیے کتب حدیث میں منقول ہوتا جب کہ نماز ہر روز پانچ دفعہ ادا کی جاتی ہے۔ اور یہ چیز مسلمانوں سے مخفی نہ رہتی۔ کیونکہ اس کی ادائیگی کھلے عام ہوتی ہے۔

مزید برآں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ۔

مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ۔

"جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی چیز پیدا کی جو کہ اس میں سے نہیں وہ چیز مردود ہے۔"

اور ارشادِ نبوی ہے۔ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَیْسَ عَلَیْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ۔ "جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس کا ہم نے حکم نہیں دیا۔ وہ عمل مردود و نا قبول ہے۔"

وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ

دستخط: شیخ ابن باز (صدر کمیٹی)، شیخ عبدالرزاق عفیفی (نائب صدر کمیٹی)، شیخ عبداللہ بن غدیان (ممبر کمیٹی)، شیخ عبداللہ بن قعود (ممبر کمیٹی)

ایسے ہی ماضی قریب کے محدث مولانا شمس الحق ڈیانوی

---

[1] یاد رہے کہ یہ فتویٰ میرے استدراک کے ساتھ کئی علمی و عالمی مجلات مثلاً البلاغ، کویت، منار الاسلام، ابوظبی اور البعث الاسلامی لکھنؤ میں چھپ چکا ہے اور کسی کو آج تک اس کی تردید کی ہمت نہیں پڑی اور نہ پڑے گی۔ الا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔ (قمر)

(صاحب عون المعبود شرح سنن ابی داؤد) سے کسی نے عیدین کے بعد مصافحہ اور معانقہ کے بارے میں استفسار کیا تو موصوف نے اس کے جواب میں جو مبسوط فتویٰ صادر فرمایا وہ ہدایۃ النجدین الی حکم المعانقۃ والمصافحۃ بعد العیدین کے نام سے مستقل رسالہ چھپ چکا ہے جو مولانا محمد عزیر السلفی کے تعارف و ترتیب کے ساتھ جامعہ سلفیہ بنارس (انڈیا) کی مطبوعہ کتاب "حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ" مؤلفہ محمد عزیر السلفی، کی شکل میں میرے پیش نظر ہے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے ۱۷ صفحات کے اس جواب میں مصافحہ و معانقہ کے تمام جائز و ناجائز پہلوؤں پر کھل کر بحث فرمائی ہے۔ اور احادیث و آثار کے علاوہ شافعی، مالکی و حنبلی علماء کے اقوال نقل فرمائے ہیں (بقول مؤلف حیات یہ نادر الوجود رسالہ ہے)

مجالس الابرار و مسالک الاخیار کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ احمد بن علی حنفی رومی مجالس ۵۰ میں کہتے ہیں کہ حدیث شریف میں دو مسلمان بھائیوں کے باہم ملاقات کرنے پر مصافحہ شروع ہوتا ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم مصافحہ کو اسی مقام پر رکھیں جہاں اسے شریعت نے رکھا ہے۔ اور ملاقات کے سوا مثلاً عیدین اور جمعہ نمازوں کے بعد مصافحہ کا جو سلسلہ آج کل چل نکلا ہے ان سے حدیث ساکت ہے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ جس پر کوئی دلیل نہ ہو وہ مردود ہے۔

آگے لکھتے ہیں، حنفی، شافعی، مالکی فقہاء نے اس کے (نمازوں کے بعد) مکروہ اور بدعت ہونے کی صراحت کی ہے جیسے الملتقط میں ہے کہ نماز کے بعد مصافحہ ہر حال میں مکروہ ہے کیونکہ صحابہ کرام نماز کے بعد مصافحہ نہیں کیا کرتے تھے بلکہ یہ رافضیوں کی عادت ہے، شافعی فقہاء میں سے حافظ ابن حجر کہتے ہیں۔ آج کل لوگ پنجگانہ نمازوں کے بعد جو مصافحہ کرتے ہیں وہ بدعت و مکروہ ہے شریعت محمدیہ میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اس کے پابند کو تنبیہ کی جائے کہ یہ عمل بدعت ہے اگر وہ باز نہ آئے تو اسے تعزیر لگائی جائے۔ جب کہ مالکی فقہاء میں سے ابن الحاج نے المدخل میں کہا ہے۔ "امام کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو اس بدعت مصافحہ سے روکیں جو انہوں نے نماز فجر، جمعہ، عصر بلکہ بعض نے پنجگانہ نمازوں کے بعد شروع کر رکھی ہے۔ یہ سب بدعت ہے۔ مصافحے کا محل مسلمان بھائی سے ملاقات ہے نہ کہ نمازوں سے سلام پھیرنا۔ اسے جہاں شریعت نے رکھا ہے وہیں رکھا جائے گا۔ لوگوں کو اس سے روکا جائے۔ اور اس خلاف سنت عمل کی وجہ سے انہیں زجر و توبیخ کی جائے۔"

مذکورہ بالا تین مذاہب کے فقہاء کی تصریحات سے ان کا اجماع مترشح ہو رہا ہے جس کی مخالفت جائز نہیں۔

رد المحتار علی الدر المختار میں بھی "تبیین المحارم" کے حوالے سے وہی الفاظ موجود ہیں جو الملتقط کے حوالے سے ہم گزشتہ سطور میں لکھ آئے ہیں۔

مولانا عبدالحق نے ترجمہ و شرح مشکوٰۃ میں کہا ہے۔ بعض لوگ پنجگانہ نمازوں یا نماز جمعہ کے بعد مصافحہ کرتے ہیں۔ جب کہ یہ ثابت نہیں۔ بلکہ تخصیص وقت کی بناء پر بدعت ہے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو رسالہ ہدایۃ النجدین ملاحظہ فرمائیں جو کتاب — حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ کے صفحہ ۲۱۹ سے ۲۲۷ تک معرّب مذکور ہے۔

محدث کبیر و محقق شہیر علامہ محمد ناصر الدین البانی حفظہ اللہ نے اپنی کتاب — سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ کی جلد اول ص۱۹ پر "من ادبہ (صلی اللہ علیہ وسلم) عند التودیع کے تحت تین احادیث ذکر کر کے آخر میں فوائد حدیث کے عنوان سے لکھا ہے کہ مصافحہ ایک ہاتھ سے سنت ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہو رہا ہے اور لسان العرب میں بھی مصافحہ کی تعریف سے یہی ثابت ہوتا ہے (کہ مصافحہ صرف دائیں ہاتھ سے ہو) اور آج کل جو بعض مشائخ کے یہاں دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کا رواج ہے یہ خلاف سنت ہے۔ آخر میں لکھا ہے۔ اما المصافحۃ عقب الصلوات فبدعۃ لا شک فیہا الخ نمازوں کے بعد مصافحہ کے بدعت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اسی بات پر حاشیہ میں لکھا ہے کہ علماء کی ایک جماعت نے اس کے بدعت ہونے کی تصریح کی ہے جن میں سے العز بن عبدالسلام بھی ہیں ص ۲۲، ۲۳ الصحیحہ ج ۱ - اللہم ارنا الحق حقا وارزقنا ... ۔

تذکرہ علمائے اہلحدیث

امیر حسن نورانی ندوی

مولانا سیّد امیر علی ملیح آبادیؒ

بلند پایہ عالم، باکمال مترجم

انیسویں صدی میں اسلامی علوم کی ترویج اور درس و تدریس میں ہندوستان کے جن باکمال علماء نے گرانقدر خدمات انجام دیں ان میں مولانا امیر علی کی حیثیت بہت نمایاں نظر آتی ہے، وہ جامع الکمالات شخصیت کے حامل تھے، لیکن ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ نہ تو ان کے علمی کارناموں کا جائزہ لیا گیا اور نہ دینی اور فنی شاہکاروں پر تحقیقی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی جس طرح خود انہوں نے زندگی میں گمنام رہنا پسند کیا، اسی طرح اب بھی ان کے حالات اور خدمات پر عدم توجہ کے پردے پڑے ہوئے ہیں، حالانکہ اس دور میں بعض معمولی شخصیتوں پر تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔

مولانا امیر علی اسلامی علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ خاص طور پر تفسیر، حدیث اور فقہ میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ:۔ "حدیث اور علم رجال اور تفسیر میں کم لوگ ان کے پایہ کے اور ان جیسے صاحب نظر قرب و جوار میں تھے"۔[1] عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا، اردو زبان و ادب سے خاص لگاؤ تھا، اپنی تحریروں میں آسان اور شگفتہ زبان استعمال کرتے تھے، بحیثیت مترجم انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ حیرت انگیز ہیں، عام معمولات کے ساتھ ساتھ اپنی مختصر زندگی میں تن تنہا جو کام کیا، وہ مترجمین اور مصنفین کا ایک ادارہ بھی مشکل سے کر سکتا ہے۔

مولانا امیر علی اودھ کے مشہور قصبہ ملیح آباد میں ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء کو پیدا ہوئے، ان کے والد ماجد سید معظم علی کا تعلق سادات کے ایک غریب خاندان سے تھا، مولانا نے ابتدائی تعلیم قصبہ کے کسی مکتب میں حاصل کی، ملیح آباد پٹھان روساء کا اہم مرکز اور نہایت بارونق مقام تھا، مدارس و مکاتب کے علاوہ جدید تعلیم کے اسکول بھی قائم ہو چکے تھے، بہت سے علماء و فضلاء بھی موجود تھے لیکن مولانا امیر علی نے اُردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم پرانے طرز کے مطابق مکتب و مدرسہ میں حاصل کی، اس کے بعد سرکاری اسکول میں داخلہ لیا، جہاں حکومت کے مقررہ نصاب کی کتابیں پڑھیں، اور ورناکیولر مڈل کا امتحان پاس کر لیا۔ مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا، ایک تو تعلیمی اخراجات زیادہ تھے، دوسرے گھر کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ یکسوئی سے تعلیم میں مصروف رہتے۔

مولانا عبدالحئی نے نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں مولانا موصوف کے حالات میں تحریر فرمایا ہے کہ جب وہ پندرہ سال کے ہوئے تو انہوں نے علوم عربیہ کی طرف توجہ کی، اور انہوں نے مولانا عبداللہ آروی، مولانا حیدر علی المہاجر، قاضی بشیر الدین عثمانی قنوجی اور مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سے مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی۔[1]

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، سوانح مولانا عبدالحی، مکتبہ برہان، دہلی ص۵۷۔

[1] مولانا سید عبدالحی، نزہۃ الخواطر، جلد ہشتم، مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن، ۱۹۷۰ء صفحہ ۷۵۔

لیکن مولانا کے شاگرد رشید اور ان کے خاندان سے قریبی تعلق رکھنے والے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے ماہنامہ صبح سعادت میں ان کے حالات پر جو ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری اسکول سے مڈل پاس کرنے کے بعد، غربت کے باعث وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے، اور گھریلو حالات سے مجبور ہو کر ملازمت کے متلاشی ہوئے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ، انیس سال کے لگ بھگ تھی ان کو بہرائچ کے ایک سب پوسٹ آفس میں پوسٹ ماسٹر کی جگہ مل گئی، ملازمت کی ضرورت کے پیش نظر انہوں نے تھوڑی سی انگریزی زبان بھی سیکھ لی، اور بہت جلد ڈاک خانہ کے فرائض منصبی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگے، افسرانِ متعلقہ ان کی کارگزاری سے مطمئن اور خوش تھے۔ مولانا بچپن ہی سے صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ کبھی بالقصد نماز ترک نہیں کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں کوئی سرکاری افسر بغرض معائنہ پہنچ گیا۔ اور پوسٹ ماسٹر کو غیر حاضر پا کر بہت چراغ پا ہوا، کسی شخص نے مسجد میں جا کر مولانا کو اطلاع دی۔ اس وقت وہ وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے اس خبر کا کوئی اثر نہ لیا اور اطمینان سے نماز ادا کر کے واپس آئے۔ افسر مذکورہ نے اعتراض کیا تو مولانا نے اس کو جواب ہی نہ دیا۔ اور نہ معذرت کی بلکہ فوراً استعفا لکھ کر پیش کر دیا۔ اور ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ حالانکہ ان کے لئے کوئی اور ذریعہ معاش نہ تھا اور گھر کی حالت بھی اچھی نہ تھی [1]

اس واقعہ کا ان کی زندگی پر انقلاب انگیز اثر پڑا، انہوں نے اپنے شاگرد مولانا ملیح آبادی سے کہا کہ "میرا خاندان اگرچہ غربت میں مبتلا تھا۔ لیکن مجھے ترکِ ملازمت پر کوئی افسوس نہیں ہوا۔ مجھے اس خیال سے بہت دکھ تھا کہ جس دین کے احکام پر عمل کرنے کے باعث مجھے ملازمت سے محروم ہونا پڑا ہے خود میں اس دین کے علم سے واقف نہیں ہوں۔ نماز تو پڑھ لیتا ہوں لیکن اس کے معانی ومطالب اور حقیقت سے نابلد ہوں۔ قرآن فہمی سے بھی محروم ہوں"۔ ان خیالات نے ان کو دینی علوم کی تحصیل پر آمادہ کیا۔ نزہۃ الخواطر میں ان کے جن اساتذہ کا ذکر ہے۔ مولانا ملیح آبادی نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے مولانا امیر علی دینی علوم کی تحصیل کے سلسلے میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مولانا فاروق ملک کے ممتاز ترین علماء کے استاذ تھے۔ جن میں علامہ شبلی نعمانی جیسی شخصیت بھی شامل ہے، جب مولانا امیر علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا فاروق ہفتوں طلبہ کو درس نہیں دیتے تھے، طلباء بیٹھے ان کے پاؤں دابا کرتے تھے، اور مولانا ایک خاص کیف کے عالم میں لیٹے رہتے تھے، مولانا کا شوقِ تحصیل علم بڑھا ہوا تھا، ان کے لیے یہ وقت بڑا صبر آزما تھا اس لیے وہاں سے لاہور چلے گئے جو اسلامی علوم وفنون اور علماء وصلحاء کا ممتاز مرکز تھا، مگر حالات کو ناساعد پا کر وہ آگرہ چلے گئے، اور وہاں چند دن قیام کر کے دہلی پہنچے، جہاں اس زمانہ میں مولانا نذیر حسین محدث کا چشمہ فیض جاری تھا، مولانا امیر علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن عربی زبان وقواعد سے بخوبی واقف نہ ہونے کے باعث درس حدیث میں شمولیت ممکن نہ تھی، اس لیے پہلے عربی زبان وقواعد، صرف ونحو کی تحصیل شروع کر دی، اور اپنی غیر معمولی محنت اور شوق کی بدولت ۹ مہینے میں اس قابل ہو گئے، کہ درس حدیث میں شرکت کی اجازت مل گئی، اس زمانہ میں مولانا عبدالحلیم شرر بھی ان کے ہم سبق تھے، نزہۃ الخواطر میں جن اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا نے ان سے کس زمانہ میں تعلیم حاصل کی، ملازمت سے قبل اس کا امکان نہیں ہو سکتا کہ دہلی جانے سے قبل ان اساتذہ سے استفادہ کیا ہو، دہلی کے دوران قیام میں انہوں نے حکیم عبدالمجید ابن حکیم

[1] ماہنامہ صبح سعادت، ماہ اپریل ۱۹۸۲ء (مضمون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

محمود خاں دہلوی سے علم طب کی بھی تحصیل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد لکھنؤ گئے، اس زمانہ میں منشی نول کشور کے مطبع کو بڑی شہرت حاصل تھی، جو اسلامی علوم کی کتابیں بکثرت شائع کر رہا تھا، اتفاق سے مولانا کی ملاقات منشی نول کشور سے ہو گئی جو بڑے مردم شناس اور اہل علم کے قدردان تھے انہوں نے مولانا سے درخواست کی کہ ان کے مطبع میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا کام انجام دیں، جسے مولانا امیر علی نے منظور کر لیا، پچاس روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا، جو اس زمانہ کے اعتبار سے معقول کہا جا سکتا ہے۔

مطبع نولکشور میں ایک قلیل مدت کے اندر انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے، جن کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، ابتدا میں مولانا مطبع کی عمارت میں بیٹھ کر کام کرتے تھے، عربی کی زیر طبع کتب کی صحت اور ان پر حواشی لکھنے کا کام ان کے سپرد تھا اس کے بعد تصنیف و تراجم کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اس وقت منشی نول کشور نے محسوس کیا کہ گھر سے مطبع تک آنے جانے میں مولانا کا وقت بہت صرف ہو جاتا ہے، اس لیے ان سے درخواست کی کہ آپ اپنے مکان پر ہی بیٹھ کر کام کریں، مولانا نے منظور کر لیا، اور گھر میں بہت زیادہ وقت صرف کرنے لگے، جس سے ان کی صحت پر اثر پڑا۔ مولانا عبدالرزاق نے اپنے محولۂ بالا مضمون میں لکھا ہے کہ ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے؟ یہ وفات سے ایک سال قبل کی بات ہے، فرمانے لگے، کہ میری عمر پچاس یا اکیاون سال ہے، مگر نول کشور نے مجھے بوڑھا کر دیا، کیونکہ انہوں نے مجھے گھر پر کام کرنے کے لیے کہا، اور میں اس خیال سے کہ کہیں وہ کام چور نہ خیال کریں، بہت محنت کی اور زیادہ سے زیادہ کام کیا، جس سے صحت بگڑ گئی، اور اب یہ حال ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔
مولانا کو حقہ نوشی کا بہت شوق تھا، منشی نول کشور ان کے لیے پینے کا تمباکو روزانہ بھیج دیتے تھے، کبھی کبھی خود بھی ان کے مکان پر حاضر ہوتے، جتنا کام مولانا روز کرتے تھے، وہ منگوا لیتے اور دوسرا کام بھیج دیتے تھے، مطبع نول کشور میں مولانا امیر علی نے جو کارنامے انجام دیئے وہ حیرت انگیز ہیں۔ بہت سی عربی و فارسی کتابوں کی صحت و اصلاح اور اضافہ حواشی سے قطع نظر انہوں نے فتاوی عالمگیری کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا، ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے، یہ ترجمہ دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوا، پہلی جلد میں مولانا نے فقہاء کے حالات اور اصول فقہ پر مشتمل ایک طویل مقدمہ کا اضافہ کیا، دوسرا شاہکار عین الہدایہ ہے، فقہ حنفی کی اس معروف کتاب کی چاروں جلدوں کا اردو ترجمہ کیا اور شرح بھی لکھی، جو چار ضخیم جلدوں میں کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے جس سے ہزاروں علماء و طلباء آج تک استفادہ کر رہے ہیں، اور موجودہ دور میں اس کی افادیت کو زیادہ محسوس کیا جا رہا ہے یہ بہت بڑا کام تھا، جو انہوں نے تن تنہا انجام دیا، ان کی سب سے بڑی تالیف تفسیر مواہب الرحمٰن ہے، جس کی نظیر فارسی اور عربی زبانوں میں بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے، یہ اردو تفسیر تیس ضخیم جلدوں میں ہے۔ گویا ہر پارہ کی تفسیر ایک جلد میں۔ بعض جلدیں آٹھ سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس میں انہوں نے مستند عربی تفاسیر کے طویل اقتباسات کو اردو میں پیش کر دیا ہے۔ خاص طور پر تفسیر ابن کثیر۔ مدارک التنزیل۔ تفسیر کبیر وغیرہ۔ ساتھ ہی فقہی مسائل کی تشریحات، تصوف و اخلاق کے رموز و نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اردو میں قرآن کی یہ سب سے بڑی تفسیر ہے۔ کئی بار مطبع نولکشور نے اس کو شائع کیا۔ اب ایک مدت سے کمیاب تھی۔ لیکن پاکستان کے ایک ناشر نے نہایت اہتمام سے شائع کر دی ہے

اس کے بعد مولانا نے دوسرا عظیم الشان کام یہ کیا کہ صحیح بخاری کا اردو ترجمہ کیا اور یہ شرح لکھی، یہ کام بڑی محنت اور جانفشانی سے انجام دیا۔ یہ ترجمہ اور شرح تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ منشی نولکشور کی وفات کے باعث یہ شائع نہ ہو سکی۔ ان کے ورثاء کو دوسری کتب کے

طباعت واشاعت سے فرصت نہ ملی، اور مسودہ معرضِ التوا میں پڑا رہا جو ابھی تک اچھی حالت میں مطبع کے محافظ خانہ میں محفوظ ہے، جس کو راقم الحروف نے ۱۹۵۸ء میں پہلی بار دیکھا تھا، اور صدق جدید میں ایک مضمون بھی اس کے متعلق لکھا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے بھی اس کی اشاعت کے سلسلہ میں اہل علم کو توجہ دلائی تھی کہ وہ مطبع کے ارباب حل وعقد کو توجہ دلائیں، یا کوئی اور ناشران سے حاصل کر کے شائع کر دے۔

مولانا نے فیضی کی مشہور بے نقطہ تفسیر سواطع الالہام کی طباعت سے قبل مسودہ کی صحت کی، اور اس پر بے نقطہ مقدمہ تحریر کیا جو ان کی عربی زبان میں مہارت کا ثبوت ہے، اردو زبان میں ترجمہ کا اتنا بڑا کام کسی اور نے تنہا کیا ہو ایسا کوئی نام نظر نہیں آتا وہ ترجمہ کے فن سے بھی خوب واقف تھے، ان بڑے کاموں کے ساتھ ساتھ تقریباً بارہ چھوٹی بڑی عربی وفارسی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ جن میں فقہ اکبر، اصول الشاشی اور طب کی ایک دو کتب بھی شامل ہیں۔ درسی کتب کے علاوہ بعض بڑے کتبِ حدیث، فقہ، منطق وفلسفہ پر بھی ان کے حواشی ہیں۔ تفسیر عرائس البیان، احیاء العلوم امام غزالی۔ قسطلانی جیسی بڑی کتب کی صحت بھی دورانِ طباعت ان کے ذمہ تھی۔ منشی نولکشور نے امام رازی کی تفسیر کا اردو ترجمہ بھی مولانا سے کرانے کا ارادہ کیا تھا اور اس کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ مگر صحت کی خرابی کے علاوہ ملک کے عام حالات سے بھی ان کی طبیعت مکدر تھی اس لیے انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز مقدس میں قیام کا قصد کر لیا۔ رخصت ہوتے وقت منشی نولکشور نے ایک معقول رقم بطور شکرانہ پیش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ حجاز سے مولانا نے منشی نولکشور کے نام جو خطوط لکھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ منشی جی کے حسنِ سلوک اور خوش اخلاقی سے بہت متأثر تھے۔ مولانا نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کی۔ وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی۔ بیمار ہو گئے۔ ان کے بڑے صاحبزادے کچھ دن علیل رہ کر وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجبوراً مولانا کو ہندوستان آنا پڑا، اس سلسلہ میں واپسی کے سفر خرچ کے لیے بھی منشی نول کشور نے ان کو معقول رقم ارسال کی۔ ہندوستان واپس آ کر کچھ عرصہ اور مطبع نولکشور میں کام کیا۔ ۱۸۹۵ء میں منشی نولکشور نے وفات پائی۔ ان کے بعد بھی مولانا کام کرتے رہے۔ سبکدوشی کے بعد مطبع کی طرف سے ان کی پنشن مقرر ہو گئی تھی۔

۱۹۱۵ء میں مولانا مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے کئی سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے لگی۔ ایک بڑے کنبہ والے غریب آدمی کے لیے بڑھاپے میں یہ رقم نعمت غیر مترقبہ تھی لیکن مولانا کے نزدیک درس وتدریس کی بڑی اہمیت تھی روپیہ کی کمی بیشی کا ان پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ چند ماہ بعد مولانا حکیم سید عبدالحی (والد ماجد حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی) ناظم ندوۃ العلماء نے مولانا کو خط لکھا کہ آپ ندوۃ العلماء میں آ کر حدیث پڑھائیے۔ خاندان کے بااثر عزیزوں نے ہر چند منع کیا، کہ اتنی بڑی تنخواہ کی ملازمت چھوڑ کر نہ جائیے۔ مگر مولینا فوراً تیار ہو گئے اور فرمایا کہ زندگی حدیث کے شوق میں گذری ہے۔ اور اب اس کی خدمت کا موقع ملا، تو کیوں نہ جاؤں، حالانکہ ندوہ میں ان کی تنخواہ ترقی کے بعد بھی ایک سو پچاس روپیہ ماہوار تک پہنچی تھی۔ مولانا عبدالحیؒ (ناظم ندوۃ العلماء) خود مولانا کے شاگرد تھے۔ لیکن مولانا امیر علی مقابلۃً ایک چھوٹے عہدہ پر کام کر رہے تھے۔ آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہونے والے اکثر طلباء بعد میں نامور علماء میں شمار کیے گئے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا بیان ہے کہ جب وہ مصر سے واپس آئے تو جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، حکومت ان کو مشتبہ نظر سے دیکھتی تھی۔ اس لیے وہ کسی مدرسہ میں داخل ہونا چاہتے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ علمِ حدیث کی تحصیل کریں۔ انہوں نے مولانا عین القضاۃؒ بانی مدرسہ عالیہ فرقانیہ (لکھنؤ) سے اپنی خواہش ظاہر کی اور پوچھا کہ فنِ حدیث کس سے اور کہاں حاصل کریں؟ ان کے پاس ایک بڑے عالم تشریف فرما تھے انہوں نے برجستہ

فرمایا کہ مولوی امیر علی ملیح آبادی کے علاوہ اس وقت فنِ حدیث میں کوئی عالم نظر میں نہیں آتا ہے۔ میں ندوۃ العلماء میں داخل ہو گیا۔ اس وقت مولانا امیر علی مہتمم تھے۔ ان سے ملنے کے بعد میں بے حد متأثر ہوا۔ اور جیسے جیسے ان سے قربت بڑھتی گئی۔ ان کی عظمت کے نقوش دل پر گہرے ہوتے گئے"

اخلاق، عادات اور عام حالات

مولانا سید امیر علی

نہایت خوش اخلاق اور با مروّت تھے۔ ان کی ذات سے کبھی کسی کو اذیت نہیں پہنچی۔ نہ کسی کی غیبت پسند کرتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر دہلی میں ان کے ہم سبق تھے۔ ایک بار کسی محفل میں ان کے اس رویّہ پر اظہار افسوس کیا کہ انہوں نے مولانا نذیر حسین محدّث دہلوی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اب ناول نگاری میں وقت صرف کرتے ہیں۔ خدا انہیں معاف کرے۔ حدیث کی تکمیل کرکے دین کی خدمت کرتے تو بھلا ہوتا۔ یہ فرمانے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ وہ غیبت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ خاموش ہو گئے۔ اور اپنی کہی ہوئی بات پر اظہار افسوس کیا۔

مولانا کو فنِ تفسیر، حدیث، فقہ اور معقولات میں مہارت حاصل تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ اور ریاضی سے بھی واقف تھے۔ اس کے باوجود ان میں غرور اور خودنمائی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ شہرت سے نفرت تھی۔ طبیعت میں بے حد انکسار تھا۔ ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس زمانہ میں ندوۃ العلماء کے حالات اچھے نہ تھے۔ مسلسل ہڑتالوں اور شورشوں نے طلباء میں سرکشی کا جذبہ ابھار دیا تھا۔ مگر مولانا کے اخلاق اور نرم برتاؤ نے نہایت سرکش طلباء کو درست کر دیا۔ ان کے زمانہ میں دارالعلوم کا انتظام اچھا تھا۔ کبھی کسی طالب علم کو سزا نہیں دی۔ خطاکار طلباء کو بلا کر سمجھاتے تھے اور ان کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ مریض طلباء کی عیادت کے لیے ان کے کمروں میں جاتے۔ اکثر روپیہ پیسے سے بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ بعض طلباء ان سے قرض بھی مانگ لیتے تھے۔ جس کے دینے میں مولانا کو کوئی عذر نہ ہوتا۔ اور یہ رقم عموماً واپس نہیں ملتی تھی۔

جس زمانہ میں مولانا مطبع نولکشور میں کام کرتے تھے۔ وہاں کے تمام ملازمین ان کے اخلاق سے متأثر تھے۔ وہ مطبع کی عمارت کے احاطہ میں جامن کے ایک پرانے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ اور گھنٹوں کام کرتے تھے۔ جب کہ دوسرے کارکن نہایت آرام دہ نشستوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ مطبع کے ایک معمر ترین ملازم منشی شیو نرائن نے مجھے مولانا کے بہت سے حالات بتائے۔ منشی شیو نرائن نے ۱۹۵۱ء میں بعمر ۹۵ سال لکھنؤ میں وفات پائی اور وفات سے چند دن قبل تک فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ ان کا بیان تھا کہ مولانا اپنے کام میں اس قدر محو رہتے تھے کہ ان کو اپنے گرد و پیش کی خبر نہ ہوتی تھی۔ جسمانی اعتبار سے دبلے پتلے اور دراز قد تھے۔ چہرہ پتلا اور رنگ گندمی تھا۔ داڑھی گول اور بہت بڑی نہ تھی۔ لباس صاف ستھرا پہنتے تھے۔ عموماً غرارہ دار پائجامہ اور لمبے دامن کی اچکن، سر پر مرادآبادی وضع کی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت پُرکشش تھی۔ چہرہ سے معصومیت ٹپکتی تھی۔ منشی نول کشور اکثر ان سے گھر ملنے جایا کرتے تھے۔ اور ان کے لیے حقہ کی تمباکو پابندی سے پہنچاتے تھے۔ جس کا مولانا کو بہت شوق تھا۔ نولکشور نے مولانا کی محنت کی بدولت بہت روپیہ کمایا۔ وہ ان کو صرف پچاس روپے ماہوار دیتے رہے۔ لیکن مولانا خود نولکشور کے مدّاح اور ممنونِ کرم تھے۔ کہتے تھے کہ اس شخص نے مجھے ایسے وقت میں سہارا دیا۔ جب میرا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔

مولانا امیر علی ندوۃ العلماء میں زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ مگر جتنا زمانہ گزارا۔ زیادہ سے زیادہ درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ ان کے حسنِ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ایک بار عربی مدارس کے سرکاری انسپکٹر معائنہ کے لیے دارالعلوم میں آئے وہ ندوہ کے سابق طالب علم تھے۔ مولانا نے اپنی کرسی ان کے لیے خالی

کردی ۔ اور وہ صاحب بلاتکلف اس پر بیٹھ گئے ۔ مولانا دوسری کرسی آنے تک کھڑے رہے ۔ انسپکٹر کا یہ برتاؤ تو مولانا نے گوارا کر لیا ۔ لیکن جب انسپکٹر نے بعض اساتذہ سے تحکمانہ لہجے میں "تم" سے خطاب کیا تو مولانا کو بہت ناگوار ہوا ۔ مصلحتاً خاموش رہے اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے ۔ اس واقعہ کا بعد میں ذکر کر کے آبدیدہ ہو گئے ۔ اور فرمایا علماء کی یہ ذلت مجھے گوارا نہیں اس لیے اب استعفا دے کر گوشہ نشینی اختیار کر لوں گا ۔ لیکن متعدد اساتذہ اور طلباء کے اصرار پر استعفےٰ کا ارادہ ترک کر دیا ۔

مولانا کا علمی مرتبہ

ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے علماء کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ اور یہ سلسلہ قرونِ وسطیٰ سے جاری ہے ۔ مختلف علوم میں خصوصی مہارت رکھنے والے بلند پایہ علماء کے حالات ، تاریخ و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں ۔ ایسی مثالیں کم ملیں گی کہ کسی شخص نے سنِ بلوغ کو پہنچ کر ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابیں تالیف کی ہوں ۔ بڑی بڑی کتابوں کے تراجم مکمل کئے ہوں ۔ اور کسی دار العلوم میں درس و تدریس کی مسند گرم کی ہو ۔ اور اس کے ساتھ انتظام اور اہتمام کی ذمہ داری بھی قبول کی ہو ۔ یہ ساری خوبیاں مولانا سید امیر علی میں جمع ہو گئی تھیں ۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ اپنے وطن ہی میں گم نام رہے ۔ آج کے دور میں جب کہ علمی تحقیقات کی گرم بازاری ہے ۔ بہت کم لوگ ان کے حالات اور علمی کارناموں سے واقف ہیں ۔ مولانا عبد الحیؒ ناظم ندوۃ العلماء جو ان کے شاگرد تھے ۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مولانا کی ذہانت و ذکاوت ۔ متانت و دیانت ، شریف النفسی و حسنِ اخلاق ۔ قوتِ حافظہ اور تبحر علمی کا بڑے اچھے لفظوں میں تذکرہ کیا ہے ۔ انہوں نے نزہۃ الخواطر میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں اعلم العلماء تھے ۔ ان کا مطالعہ گہرا اور وسیع تھا ۔ اور قرآن و حدیث اور علم الرجال کے ماہر تھے ۔[1]

مولانا کو علمِ حدیث میں مہارت حاصل تھی سینکڑوں حدیثیں زبانی یاد تھیں ۔ احادیث کے مطالب بڑے دل نشین انداز میں بیان کرتے تھے ۔ اختلافات کی وضاحت کے علاوہ عربی زبان کے الفاظ کی تشریح میں عرب شعراء کے کلام سے استشہاد کرتے تھے ۔ اور فقہی مسائل پر روشنی ڈالتے تھے فنِ اسماء الرجال میں بھی ان کو کمال حاصل تھا ۔ اکثر راویانِ حدیث کے حالات اور سن ولادت و وفات بھی حفظ تھے ۔ تفسیر کا مطالعہ اس درجہ وسیع تھا کہ مواہب الرحمان جیسی عظیم الشان تفسیر مرتب کر دی اور فقہ میں فتاویٰ عالمگیری جیسی ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ ہدایہ کی اردو شرح ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ ترجمہ میں ان جیسی مہارت کی مثال مشکل سے ملے گی ۔ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو کے سب سے بڑے مترجم تھے ۔ وہ خود مسلک اہل حدیث کے پیرو تھے ۔ لیکن ان کے تراجم و تالیفات میں اس کی جھلک بھی نظر نہیں آتی ۔

مولانا کو اردو زبان و ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا ۔ مشاہیر شعراء کے اچھے اشعار زبانی یاد کر لیتے تھے ۔ اردو زبان میں ان کی قابلیت کا اندازہ ان کے تراجم سے بخوبی ہوتا ہے ۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے ہزاروں اشعار حفظ تھے ۔ وہ بحث و مباحثہ کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ فرائضِ منصبی انجام دینے کے بعد زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں صرف کرتے ۔ اتباعِ سنت کا بہت زیادہ خیال رکھتے ۔ نہایت کم گو تھے ۔ تاہم کبھی کبھی اپنے ہم عصر علماء کی بے تکلف محفلوں میں مزاحیہ انداز سے بھی گفتگو کرتے تھے ۔ شیخ محمد عرب بن شیخ محسن یمنیؒ اس دور کے ممتاز عالم تھے ۔ اور وہ مولانا امیر علی کے سمدھی تھے ۔ نہایت ظریف الطبع اور

---

[1] مولانا سید عبد الحیؒ ۔ بحوالہ سابق

خوش مذاق تھے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ اور اردو سے ناواقف تھے۔ بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں کے محل میں رہتے تھے۔ اردو کی گالیاں بہت یاد تھیں۔ ہر ایک کے سامنے بے دھڑک گالیاں بکتے تھے۔ مولانا امیر علی ان سے مذاق کرتے تھے۔ مگر وہ کبھی ان کو گالیاں نہیں دیتے تھے۔ بلکہ بہت احترام کرتے تھے۔ انہیں شیخ محمد عرب کے صاحبزادے مولانا خلیل عرب عرصہ تک لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ راقم الحروف کے ہم محلہ تھے۔ کچھ دن ان سے عربی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبید بن محمد عرب حمیدیہ کالج بھوپال میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اس خاندان کی بدولت ہندوستان میں عربی زبان کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور متعدد دوسرے علماء نے بھی خلیل عرب صاحب سے عربی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی۔

مولانا امیر علی کو اپنے وطن اور قوم سے بہت محبت تھی۔ وہ ہندوستان پر انگریزی تسلط کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس زمانہ میں سیلف گورنمنٹ کی تحریک چل رہی تھی۔ مولانا اس کے مخالف اور کامل آزادی کے حامی تھے۔ فرماتے تھے کہ "آزادی کے معاملہ میں معتدل رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیئے"۔ بقول امام غزالی "پورے پورے یہودی بنو، ورنہ تورات سے کھیلنا چھوڑ دو"، مسلم ممالک سے بھی ان کو حد درجہ محبت تھی۔ ممالک اسلامیہ کی بربادی کا حال سن کر تڑپ جاتے تھے۔ اور ان کی فلاح کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ بقول عبدالرزاق ملیح آبادی ان کی جان بھی اسلامی ہمدردی میں گئی۔ انہوں نے مولانا کی وفات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

ایک دن وہ ندوۃ العلماء کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابھی درس کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اسی وقت اطلاع آئی کہ دمشق پر اتحادیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے مولانا کو یہ خبر سنائی تو وہ سناٹے میں آگئے اور ایک دم خاموش ہوگئے۔ ان کا تمام جسم کانپنے لگا۔ میں نے حال پوچھا تو کوئی جواب نہ دیا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو بخار ہوگیا تھا۔ نقاہت بڑھتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ فوراً سواری منگوا کر ان کے مکان پر پہنچایا۔ راستہ میں دھیمی آواز سے فرمایا۔ "خاتمہ ہوگیا! دمشق حدیث میں مسلمانوں کا آخری قلعہ بتایا گیا ہے۔ کفار نے اس پر بھی قبضہ کرلیا۔ اب زندگی بیکار ہے [1]"

اس واقعہ کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ علالت نے طوالت اختیار کرلی۔ اور دو ہفتے کے بعد ماہ رجب المرجب ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں بمقام لکھنؤ وفات پائی (ماہنامہ الفرقان لکھنؤ مارچ ۸۵ء)

---

[1] ماہنامہ صبح سعادت ۱۰ اپریل ۱۹۲۸ء (مضمون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

ابو سعید غلام نبی حیرت جلالپوری (گوجرانوالہ)

ہمارا تعلیمی بحران اور طبقاتی منافرت

مجوزہ عنوان کی علت غائی بیان کرتے ہوئے ادارہ قومی تشخص نے خود ہی وضاحت کی ہے کہ جناب قائدِ اعظم محمد علی جناح صاحب نے نئی نسل کو قوم کی شہ رگ اور تعلیم کو زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دیا اور یہ کہ اس بارے میں جس قدر غفلت اور بے توجہی کا مظاہرہ ہم نے کیا ہے اُس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ قومی تعلیمی پالیسی کی دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ تعلیمی سال بڑی بیدردی سے ضائع کئے جا رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں مساوات قائم کرنے کی بجائے غیر مخلص سرپرستی میں چلنے والے اقدار شکن، لباس شکن اور زبان شکن انگریزی میڈیم سکولوں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور یہ وہ حقائق ہیں کہ ان کے متعلق دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ مگر جہاں تک اس صورتِ حال کی ذمہ داری کا سوال ہے بظاہر تو بلا شبہ انہی دو عوامل یعنی محکمۂ تعلیم اور انگلش میڈیم سکولوں پر عائد ہوتی ہے جو ایسی صورتِ حال کے پیدا کرنے کے براہِ راست ذمہ دار ہیں مگر درحقیقت ؎

میں کھل کے بات سرِ بزم کہہ نہیں سکتا
ہزار قفل رکھے ہیں میری زبان کے لئے

اس زمرے میں اور بھی پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں مگر ان سے اس وقت صرفِ نظر کرنا ہی مناسب ہے۔ مبادا قومی تشخص کے عطا کردہ دس صفحات کا دامن اس مضمون کی وسعت پر تنگ ہو جائے ؎

میدانِ عشق تنگ ہے وحشت پہ اے حمید
جب تک ہر ایک ذرے کو صحرا کیا نہ جائے

نفسِ مضمون پر سیر حاصل تبصرہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس عنوان کے دو واضح اجزائے ترکیبی یعنی تعلیمی بحران اور طبقاتی منافرت کے مفہوم کو ذہن میں واضح طور پر مستحضر کر لیا جائے تاکہ مسئلہ زیرِ بحث کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔ کسی شے کے بحران (DEAD LOCK) سے مراد اس کی وہ حالت یا کیفیت ہے جو اسے اس کی حالتِ معمول (Normalcy) سے ہٹا کر کسی قسم کے تعطل، عدمِ استحکام یا زوال و اضمحلال سے دوچار کر دے یا اس کی نشوونما اور ترقی کی راہوں کو مسدود کر دے۔ ادبِ اُردو میں سیاسی بحران، تجارتی بحران اور معاشی بحران وغیرہ کی ترکیبیں عموماً استعمال ہوتی ہیں۔ چنانچہ تعلیمی بحران بھی اسی قبیل سے ہے۔ مگر راقم معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ ہمارا واسطہ تعلیمی بحران سے زیادہ تعلیمی فقدان سے ہے۔ کیونکہ اس کی نظر میں قیامِ پاکستان سے لے کر تادمِ تحریر یعنی کم و بیش ۳۸ سال کے طویل عرصے کے دوران وہ سورج ایک لمحے کے لیے کبھی طلوع نہیں ہوا۔ جس کی کرنوں کا استقبال اس سرزمین میں کسی قسم کی تعلیمی ترقی سے کیا گیا ہو۔ لیکن مجھے تو ڈر ہے کہ ہم نے جس تعلیمی نقطے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اس سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ گویا کہ ہم رجعتِ قہقری کے مرتکب ہوئے ہیں ؎

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی

اور جہاں تک طبقاتی منافرت کا تعلق ہے ہماری تعلیم گاہوں میں بالعموم اور انگلش میڈیم سکولوں میں بالخصوص اُس کا عمل پوری تیز رفتاری سے جاری و ساری ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہو گا کہ ہمارے طلباء کی پوری دنیا احساساتِ برتری و کمتری میں مبتلا

ہوکر رہ گئی ہے۔ حکومت کی طرف سے لباس یعنی یونیفارم کی عائد کردہ پابندیوں کے علی الرغم ہماری تعلیم گاہوں، خاص طور پر انگلش میڈیم سکولوں میں معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی عدم مساوات کا آج جس قدر اور جس طرح کا مظاہرہ ہوتا ہے اس سے بلا شبہ طلباء کی برادری کم از کم دو طبقات میں تقسیم ہوکر رہ گئی ہے اور اگر بات طبقاتی تقسیم تک ہی محدود رہتی تو بھی شاید گوارا کر لی جاتی مگر دراصل اس سے بہت آگے بڑھ کر طبقاتی منافرت تک جا پہنچی ہے جو سوشلزم اور کمیونزم کے محرکات میں سے سرفہرست ہے۔ یہ صورت پاکستان ایسی اسلامی نظریاتی اسٹیٹ کے لئے ناقابل برداشت ہے جس کا نوٹس لینا محکمہ تعلیم کے ارباب بست وکشاد پر لازم ہے۔

ہندوستان میں جس زمانے میں سیاسی اور علمی سیادت کی باگ ڈور علم دوست سلاطین، علماء و فضلائے اسلام اور صوفیائے حق آگاہ کے ہاتھ میں تھی تو ہندی مسلمانوں کا علمی تشخص و تفوق انتہائی عروج پر تھا۔ ان کی سرپرستی اور مساعی کی بدولت برصغیر کے گوشے گوشے میں چشمے پھوٹ پڑے تھے۔ سب سے پہلے عربوں کی فتوحات کے ابتدائی دور میں ابوحفص محدث بصری سندھ میں آئے۔ اور انہوں نے علوم دینیہ کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ پھر سلطان محمود غزنوی کا دور آیا۔ وہ نہایت علم دوست فاتح اور معارف آگاہ حکمران تھے۔ اس کی وجہ سے امرائے سلطنت میں علمی ذوق ابھرا۔ پھر اس کا بیٹا شہاب الدین مسعود جانشین ہوا۔ اس نے ممالک محروسہ میں کثیر تعداد میں مساجد تعمیر کرائیں۔ اور ان میں مدارس قائم کئے۔ فرشتہ لکھتا ہے —

"در اوائل سلطنت او در ممالک محروسہ چنداں مدارس و مساجد بنیاد نہادند کہ زبان از بیان تعداد آں عاجز و قاصر است"

(اس کی سلطنت کے آغاز ہی میں مفتوحہ ممالک میں اتنے مدرسوں اور مسجدوں کی بنیاد رکھی گئی کہ زبان ان کی تعداد بتانے سے قاصر ہے) اس کے بعد شہاب الدین غوری، بختیار خلجی، فیروز شاہ تغلق نے ملک کے طول و عرض میں مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں کی وسیع پیمانے پر تعمیر کرائی۔ پھر نویں صدی ہجری میں سلطان محمود خلجی مالوہ کا حاکم بنا۔ تو بے پناہ علمی ترقی ہوئی۔ وہ ارباب کمال کو دولت خرچ کرکے اپنی سلطنت میں منگواتا۔ مدرسے تعمیر کراتا۔ اور علماء و فضلاء اور طالب علموں کے وظائف مقرر کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلاد مالوہ علمی درجہ کمال کے اعتبار سے شیراز و سمرقند کے ہمسر ہوگئے۔ پھر تیموری سلاطین اکبر، جہانگیر، شاہجہان کے عہد میں زبردست علمی ترقی ہوئی۔ شاہجہان کے عہد میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو چاندی سے تلوانے کا واقعہ سب کو معلوم ہے۔ چنانچہ یہ اس کی علمی پروری ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کے عہد حکومت میں بے شمار نابغہ ہائے روزگار اہل علم و فضل مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مولانا شکر اللہ شیرازی۔ نواب سعد اللہ خان۔ مولانا محمد فاضل چشتی، مولانا عبدالسلام، ملا محمود جون پوری، مولانا محمد یعقوب لاہوری، اور مولانا ابوالفتح ملتانی جیسے علمائے کرام ملک میں جمع ہوگئے اور پھر شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیر نے ہر گاؤں، قریہ اور صوبہ میں علماء کے لیے جاگیریں مقرر کردیں۔ اس طرح برصغیر کا ذرہ ذرہ بقعہ نور بن کر جگمگا اٹھا! اور راقم کے خیال میں قیام پاکستان کے بعد ہمارے دانشور فاضل اے کے بروہی کے ذہن میں یہی پس منظر تھا جس کی بناء پر اس نے اپنے ایک مضمون (Thoughts on Education) میں یوں کہہ دیا —

"I believe that all the decisive battles for the glory, progress and prosperity of Pakistan will be fought, and either won or lost, in schools and colleges and its libraries and laboratories are going to be the theatres of its future."

مجھے یقین ہے کہ "(پاکستان کی عظمت، ترقی اور خوشحالی کی فیصلہ کن جنگ، ہار جیت سے قطع نظر سکولوں، کالجوں اور لائبریریوں میں لڑی

جائے گی اور ان کی تجربہ گاہیں ملک کے آئندہ لائحہ عمل کے لیے جولانگہ کا کام دیں گی"

یہ الگ بات ہے کہ جناب بروہی کا یہ خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں ایسے ایسے علمی مراکز قائم تھے جن کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی۔ ہمارے اس زمانے میں انگلش میڈیم سکولوں کے فارغ التحصیل رہبروں کی آگاہی کے لیے مشہور مستشرق سلی من کی کتاب ریمبلز (Rambles) کا یہ حوالہ بے محل نہ ہوگا۔

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جو ہندی مسلمانوں کے اجتماعی نظام تعلیم کے رواج سے بہتر نظام رکھتی ہوں۔ ہر وہ شخص جو بیس روپے ماہوار کے قریب تنخواہ کی کوئی ملازمت یا کام کر لیتا ہے تو وہ اپنے بچوں کو وزیر اعظم کی سطح پر تعلیم دلواتا ہے۔ جو کچھ ہمارے انگریز طلباء یونانی اور لاطینی ذریعہ تعلیم سے پڑھتے ہیں۔ وہ اس ملک کے مسلمان نوجوان، فارسی اور عربی ذریعہ تعلیم سے پڑھتے ہیں اور سات سالہ عربی نصاب ختم کرنے کے بعد ایک مسلمان طالب علم گرامر، فصاحت و بلاغت، اور منطق سے اچھی طرح آگاہ ہو جاتا ہے، بالکل اس حد تک کہ جتنا ایک انگریز آکسفورڈ میں پڑھ کر ہوتا ہے۔ اور ہندوستانی مسلمان، سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا پر مساوی طور پر خطاب کر سکتا ہے۔" چنانچہ اگر جناب بروہی نے پاکستان کی آزاد و خود مختار مملکت کے تعلیمی اور علمی مستقبل کے متعلق محولہ بالا رائے کا اظہار کیا تھا، تو کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ مگر افسوس اس امر کا ہے کہ ہم نے اپنی کوتاہ فکری اور بدتدبیری کی وجہ سے اپنی قومی آزادی کے گذشتہ سینتیس سال بوقلموں اور برائے نام تعلیمی کمشنوں کے قیام اور ان کی مرتب کردہ بھاری بھرکم رپورٹوں کی جانچ پڑتال کرنے ہی میں گزار دیئے۔ اور ہماری تعلیمی صفوں اور علمی حلقوں میں سے کوئی ایسا غیور اور قوم پرور ماہر تعلیم نمودار نہ ہو سکا۔ جو لارڈ میکالے جیسے اسلام دشمن ماہر تعلیم کے مسلم کش افکار و نظریات کا برجستہ جواب دے سکتا۔ ع

ہائے وہ خواب کہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو!

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ انگریزوں نے اپنا مخصوص نظام تعلیم وضع کرنے اور اُسے ہم پر مسلط کرنے کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ۱۸۳۰ء میں ایک ایجوکیشن کمیٹی بنائی جس کا صدر میکالے تھا۔ اُس نے اپنے ایک ماتحت افسر سر چارلس ٹریولین کے ساتھ مل کر ایجوکیشن آف انڈین پیپل کے عنوان سے ایک رپورٹ مرتب کی جس کے ساتویں باب کا مندرجہ ذیل پیرا ہماری قومی غیرت کے لئے بہت بڑا چیلنج تھا۔ بلکہ آج تک وہ ایک چیلنج ہی ہے جس کا غیرت مندانہ اور برجستہ جواب ابھی ہمارے ذمہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"مسلمانوں کا نظام تعلیم فخر و مباہات اور عزائم کے جوش و خروش پر مبنی ہے۔ اقتدار کی ہوس اور لذائذ جسمانی مذہب کی تائید میں لائے جاتے ہیں۔ کرۂ ارض مومنین کی میراث ہے۔ ان کے ماورا سب لوگ کافر ہیں اور غاصب ہیں۔ جن سے بجز سیاسی مقتضیات کے کوئی روابط نہیں رکھے جا سکتے۔ تمام زمین باختیار خداوندی مسلمانوں کی ملکیت و میراث ہے۔ اس نظام تعلیم کے بارے میں کیا کیا جائے جو اُن کو دوبارہ زندہ کر دے، تازہ کر دے اور مسلمانوں کو مستقل طور پر یاد دلاتا رہے کہ وہ کافر انگریز ہی ہیں جنہوں نے مومنوں کو ان کی بہترین میراث سے محروم کر دیا چنانچہ جب تک دیسی لوگ اپنی گزشتہ آزادی پر کڑھتے رہیں گے ان کے پاس اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے ایک ہی تدبیر ہو گی کہ وہ اس ملک سے انگریزوں کو تمام و کمال جبراً نکال دیں۔ چنانچہ صرف یورپی تصورات سے ان کو گرما کر ہی ممکن ہے کہ اُن کے قومی نظریات کو ایک نیا رخ دیا جا سکے۔ چنانچہ جن نوجوانوں کی تربیت ہمارے تعلیمی مرکزوں میں ہوتی ہے، وہ انگریزی طرز کے قومی اداروں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں ناپسند کرنے کی بجائے ہمارے ساتھ رہنے بسنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور ہمیں اپنا فطری محافظ اور محسن سمجھتے ہیں۔ اُن کی

سب سے بڑی آرزو ہمارے مشابہ ہو جانا ہے اور ہماری رہنمائی میں اپنے ہم وطنوں کے کردار کو بلند کرنے اور پُر مسرت آزادی کے حصول کی توقع رکھنے میں ہے۔" اے کاش ہمارے یہ فریب خوردہ مسلمان بھائی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پاک ہی حرزِ جان بنا سکتے۔ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔

قارئین محترم! اندازہ کیجئے کہ اُس انگریز محب قوم نے اپنے بہترین سیاسی قومی مفادات کے تحفظ و ارتقاء کے لیے کیسی نفسیاتی گہرائی میں جا کر ہندوستان [illegible] عموماً اور ہندی مسلمانوں کے تصورات حیات کا بالخصوص جائزہ لیا۔ اور پھر کس طرح مسلمانوں کے اندر ہی سے ایک مراعات یافتہ مسلم نما انگریز طبقہ یا طائفہ پیدا کیا جسے دیکھ کر علامہ اقبال مرحوم کو جواب شکوہ میں زوال مسلم کا ماتم ان الفاظ میں کرنا پڑا ہے

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

(باقی)

تحریر : اختر کاشمیری

کیا انقلاب ایران ایک صیہونی انقلاب ہے ؟

محترم اختر کاشمیری منجھے ہوئے صحافی اور دین پسند ادیب ہیں ۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں ان کو ایران کے دورے کی دعوت دی گئی تھی ۔ واپسی پر آپ نے اپنے مشاہدات کو "آتشکدہ ایران" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے ۔ ایک صاحب نے اس کتاب کے چند اقتباسات اشاعت کے لئے روانہ فرمائے ہیں ۔ جو قارئین کی معلومات میں اضافے کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں ۔ (ادارہ)

یہ کہنا کہ انقلاب ایران ایک صیہونی انقلاب ہے ۔ بظاہر ایک عجیب و غریب ناقابل یقین بات لگتی ہے ۔ لیکن یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ انقلاب سنی نہیں ہے ۔ یہ خالصتاً شیعہ بھی نہیں ہے کہ پاسداروں کے ہاتھوں سے قتل ہونے والے مجاہدین خلق خود شیعہ ہیں ۔ بنی صدر کی حمایت کے جرم میں گولی کھانے والے بھی شیعہ تھے ۔ گو سنی کردوں ، بلوچیوں وغیرہ کو بھی بھاری تعداد میں شہید کیا گیا ہے ۔ اسی طرح آیت اللہ شریعت مدار خود "جرم" حق گوئی کی سزا پا رہے ہیں ۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں ، کیسے ہیں ؟

ایک ایرانی بزرگ نے بڑی جرأت اور وضاحت کے ساتھ ایران انقلاب کے صیہونی انقلاب ہونے کے حسب ذیل دلائل دیئے ہیں جو کہ قابل توجہ ہیں ۔

" ایران کے قائد انقلاب کے کام کو تمام انبیاء کے کاموں پر ترجیح دینا ، خدا کے نام کے بعد صرف ان کا نام لینے کی تعلیم دینا ، اقوال رسول اور اقوال امیر علیہ السلام کی جگہ قائد انقلاب لکھنا ، پڑھنا ، بولنا ، سننا اور سنانا ۔ کلمۂ اسلام کے دوسرے جزو کو مٹا کر پیغمبر اسلام کے نام نامی اسم گرامی کی جگہ قائد انقلاب کا نام لینا اور اس طرح ایک نیا کلمۂ اسلام وضع کرنا ، اپنے سوا ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر سمجھنا ، عالم اسلام کے موجودہ نقشے کو بدلنے کے لیے جد و جہد کرنا ، کعبۃ اللہ پر قبضے کے لیے لوگوں کو تیار کرنا اور اس عمل کو جہاد کا نام دینا ۔ تمام مسلم سربراہان حکومت کو کافر قرار دے کر ان کا تختہ الٹنے اور ان کی حکومتوں کو ختم کرنے کے لیے قوم کو آمادہ کرنا ۔ مسجدوں میں کیمرے نصب کرنا ، تصویریں اتارنا اور اتروانا ، مسجدوں میں جوتوں سمیت جانا اور محراب مسجد میں تصویریں بنانا یا چسپاں کرنا ۔ مسجدوں میں بیٹھ کر سگریٹ نوشی کرنا ۔ شہیدوں کے قبرستان "بہشت زہرا" کو تصویروں سے ڈھانپ کر سٹوڈیو میں تبدیل کرنا ۔ ہوٹلوں میں مردوں کے کمرے صاف کرنے اور بستر بچھانے پر عورتوں کو مامور کرنا ۔ اپنے مخالفوں کو کافر کہہ کر ان کی قبریں اکھاڑنا ۔ اور لاشوں کو غیر مسلموں کے قبرستان میں ڈالنا ۔ اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں کو مقدمہ چلائے بغیر گولی مار دینا ، نماز میں امام کا مقتدیوں سے الگ ہو کر مسلح افراد کی نگرانی میں قیام کرنا ۔ امام کی حفاظت کرنے والوں کے اس عمل کو نماز کا بدل قرار دے کر ان کو خدا کے فرض سے سبکدوش کرنا ۔ امام کا ایسے شخص کی آواز پر رکوع و سجود کرنا جو نماز میں شریک نہیں ہوتا ۔ شہریوں کا رزق درباری مولویوں کے ہاتھ میں دے دینا اشیائے ضرورت کی راشن بندی کر کے عورتوں ، بچوں اور بوڑھوں کو بازاروں میں لانا اور قطاروں میں کھڑا کرنا ، زنا جیسی قبیح

بدکاری کو مذہبی تحفظ دینا۔ ولدیت کی جگہ اسم مادر کو لازم قرار دینا۔ کم سن اور معصوم بچوں کو قتل کرنا، جھوٹے الزامات اور تہمتیں تراش کر انسانوں کو زندگی سے محروم کرنا۔ نمازیوں کی جماعت پر صرف اس لیے گولی چلانا کہ وہ سرکاری مولوی کی اقتداء میں کیوں نہیں کھڑے ہوئے، آیت اللہ شریعت مدار جیسے امام برحق کو "منافق" کہہ کر نظر بند کرنا، قائد انقلاب کی تصویر کی پوجا کرنا، ان کے سامنے ان کے نام کا کلمہ پڑھنا — اگر یہ اسلام ہے تو تم بتاؤ ضد اسلام کیا ہے؟ یہ اسلامی انقلاب ہے تو صیہونی انقلاب کیا ہوتا ہے؟

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ خمینی صاحب کے حکم پر ایران کے سابق صدر بنی صدر کے زمانہ میں ایران نے اور اسرائیل کے درمیان ایک انتہائی خفیہ معاہدہ ہوا جس کے تحت کافی عرصے سے ایران کی مسلح افواج کے لیے اسرائیل اسلحہ، گولہ بارود اور فاضل پرزہ جات سپلائی کر رہا ہے۔ یہی اسلحہ اب عربوں کے خلاف ایران ؛ عراق جنگ میں استعمال ہو رہا ہے۔

ایران کے بعض حلقوں کو انقلابی حکومت کے انتہا پسندانہ مزاج، منتقمانہ اقدامات، مخصوص طرز کے انتظامات اور آمرانہ رنگ ڈھنگ کے پیچھے روس کا آہنی ہاتھ بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ حلقے ایران کے اسلامی انقلاب کو برملا روسی انقلاب کہتے اور پاسداران انقلاب کی اٹھان، پرواز، تربیت اور وحشت و دہشت کو "اشبل و زہرات" کے روسی کیمپوں کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ انقلاب کے محسوس مظاہر سے استدلال کرتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ انقلاب ایران کا انداز نظم، طریق ضبط اور طرز رفتار کمیونسٹ انقلاب کے مشابہ ہے۔ خمینی کے اقوال کی تشہیر، تصویروں کا پھیلاؤ۔ مخالف قوتوں کا گھیراؤ۔ کتابوں اور کیسٹوں کی بھرمار اور خود خمینی کا سیاہ و سفید کا مالک ہونا کمیونسٹ انقلاب کی علامت ہے۔

اس انقلاب کی منصوبہ بندی کمیونسٹ دماغ نے تیار کی ہے۔ اور اس انقلاب کی گاڑی چلانے میں بھی کمیونسٹ دماغ کارفرما ہے۔

انقلابی حکومت کے روس سے خفیہ رشتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ جب شاہ ایران کے خلاف عوامی تحریک شروع ہوئی اور شاہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب امام خمینی ایران میں داخل ہوتے ہیں تو استقبالیہ ہجوم میں لینن اور ٹراٹسکی کی کتابیں، مارکسی تعلیمات کی گائیڈ بکس اور کمیونسٹ لیڈروں کی رنگا رنگ تصویریں تقسیم ہو رہی ہیں۔ امام خمینی یہ منظر دیکھتے ہیں لیکن اس "مسرخاشاہی" استقبال کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہتے، گویا ان کے نزدیک یہ معمول کی کاروائی ہے۔ پھر جب خمینی صاحب ایران کا انتظام و انصرام سنبھال لیتے ہیں تو ۱۹ نومبر ۱۹۷۹ء کو جناب برژنیف کا یہ انتباہ نشر ہوتا ہے :۔

"اگر امریکہ نے ایران میں کوئی مداخلت کی تو روس اس کاروائی کو اپنی سلامتی کے خلاف سمجھے گا"

دنیا میں آج تک جہاں کہیں اور جب کبھی اسلامی تحریک نے سر اٹھایا، روس نے اس کی حوصلہ شکنی کی۔ اس کے خلاف محاذ قائم کر دیئے۔ اس کے قائدین کا تمسخر اڑایا گیا۔ انہیں جاہل اور رجعت پسند قرار دیا گیا۔ لیکن ایران کی مذہبی تحریک کے بارے میں اس کا رویہ حیرت انگیز طور پر بدل گیا۔ اس تحریک کی مخالفت کی گئی نہ اس کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا، اس تحریک کے قائدین کو رجعت پسند کہا گیا نہ ان کے خلاف روایتی تنگ نظری کا مظاہرہ کیا۔ اس کے برعکس دنیا بھر کے کمیونسٹ اور روسی فلسفۂ فکر کے پریس اور تنظیموں نے انقلاب ایران کی بھرپور حمایت کی۔

کسی مذہبی تحریک کے بارے میں روس کے رویے میں اس طرز کی تبدیلی پہلی بار دیکھی گئی، اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ ایران کے انقلاب پر دنیا کو اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی روس کے رویے میں آنے والے اس انقلاب پر ہوئی ہے۔

روس کے مزاج میں یہ حیرت انگیز انقلاب کیسے آیا؟ اس سوال کا جواب تاحال کسی نے نہیں دیا۔ اس سوال کا جواب ہی وہ کلید ہے جس سے روس اور ایران کے رابطوں کا سراغ مل سکتا ہے۔

روس کے پروگرام، عزائم، طریق کار اور جناب خمینی کے کعبۃ اللہ پر قبضے کے خواب کو دیکھیں تو ان کے برپاکردہ انقلاب پر روس کی حوصلہ افزا خاموشی اور روس نژاد تنظیموں کی طرف سے انقلاب ایران کی بھرپور حمایت کا معمہ حل ہوجاتا ہے۔ اس موقع پر اس نکتے کو بھی ذہن میں تازہ کرلیجئے کہ کعبۃ اللہ کو آزاد کرانے کا خواب صرف وہی ملک دیکھ رہے ہیں جو روس کے زیر اثر ہیں یا وہ ملک جو اسرائیل کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ کعبۃ اللہ کی آزادی کا نعرہ لگانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بیت المقدس سے عالم اسلام کی توجہ ہٹائی جائے اور اسرائیل بیت المقدس کے نقشے میں جو تبدیلی کرنا چاہتا ہے وہ کسی مزاحمت کے بغیر کرانے میں کامیاب ہوجائے۔

کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی پر قبضے کا پروگرام جناب خمینی کا اپنا پروگرام نہیں، یہ روس کا پروگرام ہے، جناب خمینی کو کعبۃ اللہ میں داخل ہو کر اپنے امام مہدی ہونے کا اعلان کرنے کے لیے رکھا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مسجد نبوی پر قبضہ کرکے وہ جسد رسولؐ کے دائیں بائیں سونے والے آنجناب مقدس اجسام کو دور کرنا چاہتے ہیں جن اجسام کو مسلمان رسول کریم کے جسد اطہر کے بعد سب سے زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔

روس انقلاب خمینی کے دوش پر سوار ہو کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ ایران پر سیاسی قبضے کے بعد عراق، کویت، سعودی عرب اور مشرق وسطی کے دوسرے ممالک روس کے نزدیک تر لقمہ ثابت ہوں گے۔ روس، ایران اور اسرائیل کے مابین یہ نقطۂ باہمی کی دوستی، افہام و تفہیم کا سودا، مشترکہ خواہشوں کا ملاپ اور فکری و نظری مطابقتوں کا سنگم ہے۔

بس جس نے نہیں سنا وہ سن لے، جس نے نہیں سمجھا وہ سمجھ لے۔ اور جس نے نہیں جانا وہ جان لے ۔ ۔ ۔ ۔ "

اطلاعات و اعلانات

حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کی وفات پر

تعزیت نامے

محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ تعالےٰ کی وفات حسرت آیات پر ملک بھر کے اہل توحید نے دلی غم و اندوہ کا اظہار کیا تادم تحریر جو تعزیت نامے وصول ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔ ان سب میں حضرت کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور ان کی مغفرت اور درجات عالیہ کے لیے دعائیں کی گئی ہیں۔

۱۔ مولانا سیف الرحمٰن - الفلاح - اوکاڑہ
۲۔ حافظ عبدالرحیم راشد صاحب جامعہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ - لاہور
۳۔ مولانا محمد احمد سعید جامع مسجد اہلحدیث المزمل - میاں چنوں۔
۴۔ شہزاد مزمل صاحب ناظم جمعیت اہلحدیث منڈی بہاؤالدین گجرات۔
۵۔ ناظم دارالحدیث راجووال ضلع اوکاڑہ
۶۔ مولانا قمر لکھوی صاحب ناظم نشر و اشاعت شبان علماء اہل حدیث - پنجاب۔
۷۔ مولانا سلطان محمود صاحب ناظم جمعیت اہلحدیث فرید گنج ساہیوال
۸۔ حافظ عبدالغنی صاحب مدرس کلیۃ القرآن والحدیث کریم آباد ضلع ڈیرہ غازی خان۔
۹۔ مولانا محمد طاہر طیب - ناظم نشر و اشاعت جمعیت اہلحدیث ڈربی - برطانیہ۔
۱۰۔ سید طارق محمود نقوی ناظم نشر و اشاعت جمعیت شبان اہل حدیث - واہ کینٹ
۱۱۔ شیخ محمد امجد ظہیر - ناظم جمعیت شبان اہلحدیث - ساہیوال
۱۲۔ مولانا حافظ نور احمد، قاری ظہور احمد صدیقی و احباب ظفر آباد - جھنگ صدر
۱۳۔ حافظ محمد نواز شاکر ناظم نشر و اشاعت جمعیت شبان اہل حدیث منڈی یزمان - ضلع بہاول پور۔

دعائے صحت کی اپیلیں

۱۔ جماعت کے نامور محقق اور عالم حضرت مولانا سید بدیع الدین شاہ صاحب راشدی - جناب عزیز اللہ صاحب ریٹائرڈ سشن جج اور حکیم قاضی محمد ادریس صاحب ان دنوں بوجہ علالت صاحب فراش ہیں۔ جملہ اہل توحید سے ان حضرات کے لیے دعائے صحت کی اپیل ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے (محمد عبدالکبیر گزدر - حیدر آباد)

۲۔ مرکز تحقیقات اسلامیہ سرگودھا کے سیکرٹری اور بین الاقوامی اسکاؤٹ سید طاہر مرتضیٰ بخاری ۲۳ مئی کو ٹرک اور سکوٹر کے حادثہ میں شدید زخمی ہو گئے اور اس وقت جنرل ہسپتال

لاہور میں زیر علاج ہیں۔ اور ان کے والد سید بشیر حسین بخاری نے اپیل کی ہے کہ نمازوں میں عزیز کی صحت کاملہ کے لیے دعا کی جائے۔

(عارف بخاری - سرگودھا)

سید الانام کانفرنس

دارالحدیث جامعہ ابراہیمیہ منڈی کنگن پور ضلع قصور میں ۶ جولائی بروز ہفتہ یک روزہ سید الانام کانفرنس منعقد ہوگی جس میں جید علمائے اہل حدیث خطاب فرمائیں گے۔ ۵ جولائی کو جمۃ المبارک کے خطبے کے بعد درس گاہ میں صوبائی پارلیمانی سیکرٹری پنجاب سردار طفیل احمد خاں میواتی عوام سے خطاب فرمائیں گے اور علاقے کے مسائل سنیں گے (منتظمہ کمیٹی دار الحدیث جامعہ ابراہیمیہ منڈی کنگن پور تحصیل چونیاں ضلع قصور)

مدارس میں داخلے

۱۔ دارالعلوم محمدیہ اہل حدیث مصطفےٰ آباد میں داخلہ ۲۵ شوال تک جاری رہے گا۔ مڈل پاس طلبہ کو ۵ روپے ماہانہ وظائف، خوراک، رہائش، کتب، کاپیاں وغیرہ نیز بی اے تک تعلیم کا ۱۲ سالہ کورس ہوگا۔ تحفیظ القرآن کے لیے بہترین قاری کا انتظام ہے۔ طلباء سرپرست کو ساتھ لائیں اس کے بغیر داخلہ نہیں ہوگا۔ (عبدالقیوم مہتمم دارالعلوم محمدیہ اہل حدیث مدنی روڈ عقب ڈاکخانہ مصطفےٰ آباد (دھرم پورہ) لاہور) (فون نمبر ۳۲۳۹۸۷)

۲۔ المدرسۃ العالیۃ تجوید القرآن لاہور میں گذشتہ سال سے دوبارہ تجوید و قراءۃ کا اجراء کر دیا گیا ہے۔ اس کے لیے معروف ماہر فن استاذ القراء والقاری المقری محمد ادریس صاحب عاصم فاضل مدینہ یونیورسٹی المدینۃ المنورہ فاضل قراءات سبعہ و عشرۃ کی خدمات حاصل ہیں۔ ۱۰ شوال سے نیا داخلہ شروع ہے۔ مدرسہ میں تجوید کے علاوہ قراءۃ سبعۃ و عشرۃ و رسم القرآن و ضبط القرآن کی بھی تعلیم دی جائے گی۔ تجوید کے طلباء کے لیے عربی کا بھی معقول انتظام ہے۔ رہائش، خوراک، لباس، علاج معالجہ کا کفیل مدرسہ ہے۔ اپنے سرپرست کے ہمراہ ناظم مدرسہ سے رابطہ قائم کریں (ناظم المدرسۃ العالیۃ تجوید القرآن بنگلہ ایوب شاہ جامع مسجد اہلحدیث لسوڑیوالی۔ لاہور)

ضرورت مدرس

کلیۃ دار القرآن والحدیث کے شعبۂ درس نظامی میں پڑھانے کے لئے ایک قابل، محنتی، متدین مدرس کی ضرورت ہے۔ خواہش مند حضرات درج ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں (مولانا) محمد عبداللہ امرتسری مہتمم کلیۃ القرآن دار القرآن والحدیث جناح کالونی فیصل آباد)

تعمیر مسجد و مدرسہ سے تعاون کی اپیل

۱۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عثمان آباد (تیج گڑھ عقب سوتر مل جی ٹی روڈ لاہور ۹) میں دو کنال کا رقبہ جامع مسجد اہل حدیث کے لیے خرید لیا گیا ہے جس کی تعمیر کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہال کی بنیادیں تیار ہو چکی ہیں۔ بقایا درج ذیل امور زیر تکمیل ہیں۔ • جامع مسجد • دینی درس گاہ برائے اطفال اور برائے بنات المسلمین • ڈسپنسری • مکانات برائے عملہ۔ ان تمام امور کی انجام دہی کے لیے ظاہر ہے لاکھوں کی ضرورت ہے لہٰذا جماعت کے اصحاب خیر کے باب عالی پر دستک دینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بنا بریں جماعت کے اصحاب ثروت اس عظیم منصوبہ کی تکمیل کے لیے آگے بڑھیں۔ اور سریا، سیمنٹ، بجری، لکڑی اور مزدوروں، راجوں کی اجرت یومیہ وغیرہ کے لئے خالصۃً لوجہ اللہ ہر قسم کے تعاون سے ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں۔ اور اپنے لیے جنت میں گھر بنائیں۔ اور درج ذیل پتہ پر اپنا تعاون ارسال فرمائیں (حکیم) غوثی محمد یونانی اکسیری دواخانہ اڈہ چھپیل جی ٹی روڈ۔ ڈاکخانہ باٹا پور۔ لاہور ۹)

۲۔ بستی چھینہ تحصیل جام پور میں ایک مسجد زیر تعمیر ہے۔ مقامی جماعت بہت ہی غریب ہے۔ مخیر احباب سے اپیل ہے کہ وہ اس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں (مولانا محمد لیسین راہی ناظم ادارہ تبلیغ جمعیت اہل حدیث جام پور ضلع راجن پور)

ضروری اعلان

۱۔ خبریں اور اعلانات مختصر بھیجیں۔
۲۔ تبلیغی رودادیں اور دیگر غیر ضروری تفصیلات شائع نہیں ہوں گی (۳) مضامین صاف اور خوش خط لکھیں۔
(۴) آیات و احادیث کے حوالے مکمل درج کریں۔ (ادارہ)

PHONE 4406 WEEKLY AL-AITISAM LAHORE RL NO. 5523
5-7-85

طابع: چوہدری عبدالباقی نسیم • مطبع: اومنی پرنٹرز، لاہور • ناشر: محمد عطاء اللہ حنیف • مقامِ اشاعت: شیش محل روڈ، لاہور